مسلم پرسنل لا کا مسئلہ

تعارف و تجزیہ

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

فہرست

ابتدائیہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری بورڈ ۷

تمہید

۱۔ **پہلا مسئلہ**: مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ ۹

۲۔ قانون کون بنائے؟ ۱۰

۳۔ اللہ کا قانون ہی انسانیت کے لئے باعث رحمت ہے ۱۱

۴۔ مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ ۱۲

۵۔ مسلم پرسنل لا- برطانوی عہد میں ۱۲

۶۔ شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۳

۷۔ مسلم پرسنل لا- دستور ہند میں ۱۴

۸۔ حکومت کے بدلتے ہوئے تیور ۱۵

۹۔ **دوسرا مسئلہ**: مسلم پرسنل لا کی مذہبی اہمیت ۱۶

۱۰۔ قرآن میں نکاح کے احکام ۱۶

۱۱۔ وہ رشتے جن سے نکاح حرام ہے ۱۷

۱۲۔ تعدد ازدواج ۱۹

۱۳۔ مہر ۲۰

۱۴۔ زوجین کے اہم حقوق ۲۱

۱۵۔ مرد قوام اور رئیس خانہ ہے ۲۲

۱۶۔ ازدواجی الجھنوں کا حل ۲۴

۱۷۔ بیوی کی سرزنش اور اس کے حدود ۲۴

۱۸۔ اختلاف دور کرنے میں سماج کی ذمہ داری ۲۶

۱۹۔ طلاق۔ ایک ناخوشگوار ضرورت ۲۷

۲۰۔ طلاق دینے کا طریقہ ۲۸

۲۱۔ عدت ۲۹

۲۲۔ طلاق رجعی ۳۰

۲۳۔ طلاق بائن ۳۱

۲۴۔ خلع ۳۲

۲۵۔ نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ ۳۳

۲۶۔ مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری ۳۵

۲۷۔ اجرت پرورش ۳۵

۲۸۔ اسلام کا نظام میراث ۳۶

۲۹۔ قانون میراث کے چند بنیادی اصول ۳۶

۳۰۔ مرد وعورت کے درمیان فرق کیوں؟ ۳۷

۳۱۔ اولاد کا حصہ ۳۸

۳۲۔ والدین کا حق ۳۸

۳۳۔ شوہر وبیوی کا حق ۳۹

۳۴۔ ایک اہم اور قابل توجہ نکتہ ۴۰

۳۵۔ مہر بھی دَین میں داخل ہے ۴۱

۳۶۔ قانون وصیت ۴۲

۳۷۔ وصیت کی مقدار ۴۲

۳۸۔ وارث کے حق میں وصیت ۴۲

۳۹۔ یتیم پوتے کے مسئلہ کا حل ۴۳

۴۰۔ لے پالک کا مسئلہ ۴۳

۴۱۔ مسلم پرسنل لا کی شرعی اہمیت ۴۵

۴۲۔ **تیسرا مسئلہ**: خطرات اوراندیشے ۴۶

۴۳۔ کیا یکساں سول کوڈ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی؟ ۴۷

۴۴۔ **چوتھا مسئلہ**: ہماری ذمہ داریاں ۴۸

۴۵۔ (۱) نظام قضاء کا قیام اوراس کی شرعی اور سماجی اہمیت ۴۹

۴۶۔ (۲) قانون شریعت کی افادیت کا ادراک ۵۱

۴۷۔ (۳) احکام شریعت پرعمل ۵۱

۴۸۔ (۴) اتحادامت ۵۲

۴۹۔ آخری بات ۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے چھٹے اجلاس منعقدہ مدراس ۱۹۸۶ء میں اس موضوع پر ایک خطبہ دیا تھا، خطبہ کیسٹ سے نقل کیا گیا اور اسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے پہلی بار حیدرآباد سے شائع کیا۔ اس رسالہ کی اہمیت اور افادیت کو دیکھتے ہوئے دوبارہ یہ رسالہ نظر ثانی کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے ستمبر ۱۹۹۳ء میں شائع کیا گیا تھا اور اب اضافوں کے ساتھ از سرنو اسے کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانان ہند کے لئے نہایت اہم مسئلہ ہے، بلکہ اسی سے ان کا ملی اور مذہبی وجود اور بقا متعلق ہے، انہی قوانین کے تحفظ کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا ہے، جو مسلمانان ہند کا سب سے زیادہ نمائندہ اور باوقار متحدہ پلیٹ فارم ہے، اور ہر آنے والے دن اس نمائندہ ادارے کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سمجھیں کہ مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کیا اہمیت ہے؟ ملک کے دستور و آئین میں اس کا کیا مقام ہے؟ قانون شریعت کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کی کیا حقیقت ہے؟ اور اسلام کے عائلی قوانین کس قدر مصالح پر مبنی ہیں؟ اور کس خوبی اور اعتدال کے ساتھ انسان کی سماجی ضروریات کو پورا کرتے ہیں؟ ہمیں اس بات سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ اس وقت مسلم

پرسنل لا کی تحریک کو کیا خطرات درپیش ہیں اور ان خطرات سے کس طرح نبرد آزما ہو سکتے ہیں؟

قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب دامت برکاتہم نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ جو اب صدر بورڈ منتخب ہوئے ہیں اور جو اس بورڈ کے قیام سے ہی ہندوستان میں قانون شریعت کے تحفظ کی تحریک سے وابستہ رہے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ان تمام پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ خاص طور پر آیات قرآنی کی روشنی میں آسان اور عام فہم زبان میں روشنی ڈالی ہے جسے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ یہ رسالہ مسلم پرسنل لا کی حقیقت اور اس کی شرعی اہمیت، اس کو درپیش خطرات اور مشکلات کو دور کرنے اور غلط فہمیوں کے ازالہ کرنے میں نہایت مفید اور مؤثر ثابت ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کے نفع کو عام و تام فرمائے اور حضرت قاضی صاحب کا سایہ تادیر اس امت پر قائم رکھے۔

سید نظام الدین

(جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

نحمده نصلي على رسوله الكريم، أما بعد.

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ اس وقت ایک سلگتا ہوا مسئلہ ہے، عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ مسلم پرسنل لا انگریزی قانون ہے جس میں جب چاہیں ترمیم وتبدیلی کرتے رہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا اسلامی نقطۂ نظر سے کیا اہمیت رکھتا ہے؟ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل کو کیا خطرات درپیش ہیں، اور چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ان چاروں سوالات کے گرد آئندہ صفحات میں گفتگو کی جائے گی اور مکمل وضاحت کی جائے گی تاکہ اس مسئلہ کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

پہلا مسئلہ: مسلم پرسنل لا کیا ہے؟

پہلا مسئلہ مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ اس سلسلے میں بہت مختصر الفاظ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی سوسائٹی اور کوئی بھی سماج قانون کے بغیر منظّم نہیں رہ سکتا۔ قانون لوگوں کے حقوق وفرائض متعین کرتا ہے۔ سڑک پر ہر شخص کو چلنے کی اجازت ہے، لیکن اگر ٹریفک کا کوئی قانون متعین نہ ہو، ہر شخص کو ہر سمت سے چلنے کی اجازت ہو اور سگنل کا نظام نہ ہو، تو یقیناً روزانہ سیکڑوں حادثات ہوں گے اور نہ جانے کتنی جانیں اس بدنظمی کی نذر ہوجائیں گی، اسی کے سدباب کے لئے قانون ایک محافظ کا رول ادا کرتا ہے اور زندگی کی تنظیم اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

قانون کون بنائے؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان کے لئے قانون بنانا کس کا حق ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص کسی مشین کو بناتا ہے، یا کسی نئی چیز کو وجود میں لاتا ہے تو وہی اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتاتا ہے اور اس کی رہنمائی کے مطابق اس مشین کا استعمال کیا جاتا ہے، انسان ظاہر ہے کہ خود اپنا خالق نہیں، انسان نے خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا بلکہ وہ پیدا کیا گیا ہے اور یہ پیدا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے ''**أَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ**'' [الواقعہ: ۵۹] (کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں)۔

اس لئے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ ہی کا حکم چلے گا، اور اسی کا بنایا ہوا قانون انسان کے لئے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار اس کی صراحت فرمائی ہے کہ حلال وحرام کے فیصلے کرنا اللہ ہی کا حق ہے ''**إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ**'' (الانعام/۵۷) (حکم صرف اللہ کا)، کیوں کہ جو خالق ہو وہی صاحب امر بھی ہوگا ''**أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ**'' [الاعراف/۵۴] (سن لو اسی کو پیدا کرنے اور حکم دینے کا حق ہے)۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ قانون بنانے والی شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں دو باتیں پائی جائیں: علم اور عدل۔ علم اس لئے ضروری ہے کہ جو انسان کی ضروریات، انسان کے مفادات وجذبات، اور انسان پر پیش آنے والے حالات سے آگاہ نہ ہو، وہ اس کی زندگی کے بارے میں کیسے رہنمائی کرسکتا ہے؟ اور عدل اس لئے ضروری ہے کہ قانون کا مقصد ظلم کو روکنا اور تقاضائے انصاف کو پورا کرنا ہے، کہ جو خود عادل نہ ہو اور انصاف کرنے کی صلاحیت یا اس کا مزاج نہ رکھتا ہو، اس سے اس بات کی امید کیوں کر رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمام انسانی طبقات کے بارے میں عدل سے کام لے گا؟

غور کیا جائے تو انسانوں کا کوئی طبقہ، ایک فرد، یا افراد کا مجموعہ قانون وضع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے کہ انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی ضروریات سے واقف نہیں بلکہ وہ خود اپنے مفادات سے بھی آگاہ نہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کسی کام کو مفید سمجھ کر شروع کرتا ہے لیکن وہ آخر میں اس کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے، نفع بخش سمجھ کر ایک قاعدہ وضع کرتا ہے لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد ٹھوکر کھاتا ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون ہی انسانیت کے لئے باعث رحمت ہے؟

اللہ ہی وہ ذات ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے، انسان مرد ہو یا عورت، باپ بیٹے ہوں، یا بھائی بہنیں، گورے ہوں یا کالے، کوئی سا بھی خاندان ہو یا قبیلہ، بلکہ انسان ہو یا جانور، بہائم و مویشی ہوں یا کیڑے مکوڑے سب کا پیدا کرنے والا وہی ہے، وہ جانتا ہے کس شئی کو اس نے کس لئے پیدا کیا ہے اور کس شئی کے اندر کس بوجھ کو اٹھانے کی صلاحیت ہے، غرض یہ کہ ہر شئی کی بناوٹ، اس کی تخلیق کے مقصد اور اس کی اندرونی صلاحیت کو پوری طرح جاننے والا وہی خالق ہے، وہ کسی چیز کا محتاج وضرورت مند نہیں، اس لئے مخلوقات سے خالق کا کہیں ٹکراؤ نہیں ہوسکتا، اسی لئے وہ پوری انسانیت کے ساتھ عدل اور انصاف کا برتاؤ کرسکتا ہے، پس چونکہ اللہ تعالیٰ علیم ہیں خبیر ہیں، سمیع ہیں، بصیر ہیں اور علم وعدل ان کی ذاتی صفت ہے جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوسکتی، اس لئے قانون بنانے کا اختیار بھی انہیں کو ہے اور انہیں کا بنایا ہوا نظام بہتر اور خیر ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ'' [آل عمران/۱۹]
(بیشک دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری)۔
یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں کے لئے جو قانون مفید اور جو نظام زندگی معتبر

ہے، وہ صرف ''اسلام'' ہے۔

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو قانون ہمیں عطا فرمایا ہے، اس کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے ایک شعبہ اس قانون کا ہے جو انسانی سماج اور معاشرہ سے متعلق ہے، جس پر خاندانی نظام کی بنیاد و اساس ہے، جو سماجی تعلقات کے اصول بتاتا ہے، جس میں خاندان کے مختلف افراد کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے، ان ہی قوانین کو آج عرب علماء ''قوانین احوال شخصیہ'' یا اردو میں ''عائلی قوانین'' اور انگریزی میں ''پرسنل لا'' یا ''فیملی لا'' (Family Law) کہتے ہیں۔

مسلم پرسنل لا برطانوی عہد میں:

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، گو عام طور پر ان حکمرانوں کو اسلام سے وہ تعلق نہیں تھا جو ہونا چاہئے، اور جو ایک مسلمان سے اس کے دین کا مطالبہ ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسلامی قانون نافذ تھا، جب انگریز اس ملک پر مسلط ہوئے تو آہستہ آہستہ قانون اسلامی کے مختلف شعبوں کو ختم کردیا گیا، سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کیا، پھر قانون شہادت اور قانون معاہدات منسوخ کئے گئے، بالآخر نوبت ''معاشرتی قوانین'' جن میں نکاح وطلاق، خلع، میراث وغیرہ داخل ہیں، کے بارے میں غور کرنے کی آئی کہ کیا ان قوانین میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے ''رائل کمیشن'' (Royal Commission) مقرر کیا، اور غالباً چار بار یہ کمیشن بیٹھا، ہر بار وہ

اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ان قوانین کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، اس لئے ان قوانین میں کوئی تبدیلی براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ انگریز ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے اور انہوں نے طے کیا کہ ان مسائل میں مسلمان ''قانون شریعت'' پر اور ہندو ''دھرم شاستر'' پر عمل کریں گے۔

شریعت اپلیکیشن ایکٹ:

لیکن ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عدالت میں ایک مسلمان لڑکی نے اپنے والد کے ترکہ میں میراث کے لئے مقدمہ دائر کیا، ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی کے نقطۂ نظر سے بیٹی لازمی طور پر اپنے باپ کے متروکہ میں وارث ہوتی ہے، بھائی نے اس مقدمے میں جواب دیا کہ چونکہ میں نسلی طور پر فلاں ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور ہندوؤں کے یہاں لڑکیوں کو باپ کے ترکے میں حصہ نہیں ملتا، یہی رواج ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے اس لئے مجھ پر قانون شریعت کا نفاذ نہیں ہونا چاہئے، برطانوی قانون میں رواج کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ یورپ کے اکثر ملکوں کے قانون رومن لا (Roman Law) سے ماخوذ ہے اور (Roman Law) میں رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسے قانون کا اہم ترین سرچشمہ تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ عدالت نے رواج کو اصل مانتے ہوئے بھائی کے حق میں فیصلہ دیا اور لڑکی کو اپنے باپ کے ترکہ سے محروم رکھا جو قطعاً قرآنی طریقے کے خلاف تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ عورتوں کے ساتھ نہایت ظلم کی بات ہے کہ محض عورت ہونے کی بنا پر اسے میراث سے محروم کردیا جائے، یہ وہ وقت تھا کہ تمام علماء چیخ پڑے اور پورے ہندوستان میں آواز اٹھائی گئی، ہمارے اکابر علماء نے بڑی زبردست جدوجہد کے بعد شریعت اپلیکیشن ایکٹ پاس کرایا، اور ہمارے اکابر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ العلماء ہند اور دیگر علماء و مشائخ کی مسلسل اور متحدہ کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلیکیشن ایکٹ'' بنا۔ اس قانون کے مطابق ''نکاح، طلاق، خلع، ظہار، مباراۃ، فسخ نکاح، حق پرورش، ولایت، حق میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ'' سے متعلق معاملات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو شریعت محمدی ﷺ کے مطابق ان کا فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف اور رواج کچھ بھی ہو اور قانون شریعت کو عرف و رواج پر بالا دستی حاصل ہوگی۔

مسلم پرسنل لا - دستور ہند میں:

یہ شریعت اپلیکیشن ایکٹ ایک اہم اور دور رس نتائج کا حامل قانون تھا، جو ہندوستان میں مسلمانوں کو پرسنل لا کا تحفظ فراہم کرتا تھا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد بنیادی حقوق میں ''عقیدہ و ضمیر کی آزادی'' اور ہر مذہب والوں کے لئے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی کی دفعات رکھی گئیں، یہ دفعات مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہیں کیونکہ مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین کتاب و سنت پر مبنی ہیں، اگر ان میں مداخلت کی گئی تو یہ مذہب پر عمل کرنے میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا، نیز بحیثیت مسلمان جو احکام قرآن و حدیث میں موجود ہیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور اس کے مخالف قانون کو قبول نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق کے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں اگر ہم اپنی زندگی کے لئے ان کے مقابلے میں کسی اور قانون کو بہتر اور قابل عمل سمجھتے ہیں، تو یہ بھی کفر ہے، پس گویا مسلمانوں کو ان قوانین میں تبدیلی قبول کرنے پر مجبور کرنا ان کو عقیدہ اور ضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنا ہے، حالانکہ آئین ہند میں بنیادی حقوق کے ذیل میں مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے جس کا لازمی مطلب مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی گارنٹی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے دستور کے رہنما اصولوں میں ایک دفعہ (دفعہ ۴۴) یکساں سول کوڈ سے متعلق رکھ دی گئی ہے، دستور ساز اسمبلی کے مسلم نمائندوں نے دستور بننے کے وقت بھی اس پر اعتراض کیا تھا، لیکن بہرحال یہ شق دستور میں باقی رہی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ رہنما اصول میں بہت سی ایسی مفید ہدایات بھی موجود ہیں جن کے بارے میں حکومت نے کبھی غور کرنے کی بابت سوچا بھی نہیں، حالانکہ عوامی نقطۂ نظر سے ان پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے، اور جو لوگ اپنے آپ کو روشن خیال اور دانشور کہتے ہیں ان کو بھی اس جانب توجہ نہیں ہوئی۔

حکومت کے بدلتے ہوئے تیور:

لیکن دستور کے نفاذ کے کچھ ہی سالوں بعد سے یکساں سول کوڈ کی آواز اٹھنے لگی، اور ایسے گمراہ فکر لوگوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا جن کو نہ اپنی قوم میں کوئی اعتماد حاصل ہے اور نہ قانون شریعت سے وہ صحیح طور پر آگاہ ہیں، بالآخر ۱۹۷۲ء میں متبنی بل پیش ہوا جس کا مقصد بلاتفریق مذہب ملک کی تمام قوموں کے لئے متبنی کو اپنی اولاد کا درجہ دینا قرار پایا اور ان کو لے پالک لینے والے مرد وعورت کے ترکہ میں وارث قرار دیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ قانون نہ صرف اسلام کے خلاف ہے بلکہ عقل وخرد کے بھی خلاف ہے، کیونکہ والدین اور اولاد کا رشتہ ایسا نہیں کہ صرف زبان سے وجود میں آجاتا ہو، یہ ایک فطری رشتہ ہے، اور ایک فطری محبت جو والدین اور اولاد میں ہوا کرتی ہے اس مصنوعی رشتے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام ہی مکاتب فکر نے اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ان حالات کے نتیجہ میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایک اجلاس بلایا، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ

رحمانی صاحبؒ نے بڑے خطرے اور اس کی نزاکتوں کو محسوس فرمایا اور اس وقت کے اکابر علماء دیوبند، دانشور اور قانون داں بھی اکٹھا ہوئے، انہوں نے بعض بہت اہم فیصلے کئے، انہی میں سے ایک اہم فیصلہ ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کے کنونشن کے انعقاد کا تھا جسے وہاں کے علماء، دانشوروں، مسلم سماجی کارکنوں اور مختلف جماعتوں کے ذمہ داروں نے حسن وخوبی کے ساتھ ۲۷-۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر کالج میں منعقد کیا، اس کنونشن کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

دوسرا مسئلہ: مسلم پرسنل لا کی مذہبی اہمیت:

یاد رکھنا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا جن شعبہائے زندگی کے قوانین کو شامل ہے، وہ نہایت اہم ہیں اور ان کی جڑیں کتاب وسنت میں پیوست ہیں، بلکہ زیادہ تر احکام وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح تصریحات وہدایات موجود ہیں۔

قرآن میں نکاح کے احکام:

مسلم پرسنل لا میں پہلا مسئلہ نکاح کا آتا ہے، نکاح کو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی سنت قرار دیا ہے، آپ کا ارشاد ہے: "النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي"، "فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي" (بخاری شریف: ۵۰۶۳، مسلم شریف: ۱۴۰۱)۔

خود قرآن نے اس رجحان کو پسند نہیں کیا کہ کوئی شخص زندگی بھر نکاح نہ کرے، ارشاد ہے: ''وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا'' [الحدید/۲۷] (اور ایک ترک کر دینا دنیا کا جو انہوں نے بات نکالی تھی، ہم نے نہیں لکھا تھا یہ ان پر مگر انہوں نے (اس کو اپنے اوپر عائد کیا) اللہ کی رضا مندی چاہنے کو پھر نہ نباہا اس کو جیسا چاہئے تھا نباہنا) رہبانیت اور انسان کے فطری جنسی جذبات کو

کچلنا بہت سے لوگوں نے اسے مذہبی عمل سمجھا ہے، لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے رہبانیت اور ازدواجی رشتے سے بے تعلقی (برہم چرج) ایجاد کیا وہ اپنے اس عہد کو پورا نہیں کر سکے، ہم نے ان پر یہ فرض نہیں کیا تھا انہوں نے اپنے طور پر اسے اوڑھ لیا مگر اس کو پورا نہ کر سکے۔

بلکہ قرآن نے نکاح کا امر فرمایا ہے: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ'' [النساء/۳] (تو نکاح کر لو ان عورتوں سے جو تم کو اچھی لگیں) اور ساتھ ساتھ جن خواتین کا نکاح نہیں ہوا ہے ان کا نکاح کرا دینے کا حکم دیا: ''وَاَنْكِحُوْا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ'' [النور/۳۲] (اور عورت و مرد کے اس رشتے کو رحمت اور سکینت بتایا:) ''وَمِنْ آيَاتِهٖ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً'' [الروم/۲۱] (اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے پیدا کیا تم ہی میں تمہارے جوڑے (بیویاں) تا کہ تمہارے لئے موجب سکینت ہو اور پیدا کر دیا تم لوگوں کے درمیان محبت اور ایک دوسرے پر رحم کا جذبہ)۔

وہ رشتے جن سے نکاح حرام ہے

مسلم پرسنل لا کے سامنے قانون نکاح کا مسئلہ آتا ہے، تو پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کن رشتوں میں نکاح حرام ہے اور کن میں حلال، قرآن نے تفصیل کے ساتھ ان رشتوں کی فہرست بتائی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ جن رشتوں کو قرآن نے حرام کیا ان کے علاوہ دیگر رشتوں میں نکاح حلال ہے۔

مسلم پرسنل لا کا یعنی قانون شریعت کا یہ حصہ مندرجہ ذیل آیتوں کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے، نسبی رشتوں کی وجہ سے نکاح کرنا مندرجہ ذیل خواتین سے حرام ہے: ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھائی کی بیٹیاں، بہن کی بیٹیاں۔

دودھ کے رشتے کی وجہ سے رضاعی ماں سے، یا رضاعی بہن سے نکاح حرام ہے، اور حدیث نبوی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں۔ سسرالی رشتوں کی وجہ سے: اپنی ساس سے، اور اپنی منکوحہ جن سے رشتہ قائم ہو چکا ہو ان کی بیٹیوں سے (جو دوسرے شوہر سے ہوں) نکاح حرام ہے، اسی طرح اپنے صلبی لڑکوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے، اور دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، عارضی حرمت اس صورت میں ہے کہ جب تک ایک بہن نکاح میں ہو تو اس کی دوسری بہن سے نکاح حرام ہوگا، اسی طرح حدیث نبوی سے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور اس کی بھانجی کو ایک ساتھ جمع کرنا حرام ہے۔

''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ. إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' [النساء/۲۳] (حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں بھائی کی اور بہن کی اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ کی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جن کو جنا ہے تمہاری ان عورتوں نے جن سے تم نے صحبت کی اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے ہیں اور یہ کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

ان رشتہ داروں کے علاوہ بقیہ عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی۔

تعدد ازدواج:

اگر کوئی شخص واقعی ایک سے زیادہ بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور وہ دوسرے نکاح کے سلسلے میں سنجیدہ ہے، صرف پہلی بیوی کو تکلیف پہنچانا مقصود نہیں، تو زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دی گئی:

”فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ“ [النساء/۳] (تو نکاح کرلو ان عورتوں سے جو تم کو اچھی لگیں دو دو، تین تین، چار چار)۔

یہ اجازت اس وقت ہے جب وہ محسوس کرتا ہو کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل کے تقاضہ کو پورا کر سکے گا، اور اپنے آپ کو ظلم وتعدی سے بچا سکے گا، اور اگر اسے اس کا خطرہ ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی میں انصاف نہیں کر سکے گا تو وہ بس ایک پر اکتفا کرے۔

”فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً“ [النساء/۳] (پس اگر تم ڈرو کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کرسکو گے تو بس ایک)۔

ظاہری سلوک اور برتاؤ، خوراک وپوشاک وغیرہ میں تو عدل رکھنا ہی ہے، جہاں تک ممکن ہو محبت اور دلی لگاؤ بھی سبھی بیویوں کے ساتھ یکساں ہونا چاہئے، لیکن چونکہ یہ انسان کے قابو میں نہیں اس لئے ہدایت دی گئی کہ کم سے کم اتنا ہو کہ ایک ہی کی طرف پورا جھکاؤ نہ ہو جائے کہ دوسری بیوی کی طرف سے غافل وبے توجہ ہو جائے۔

”وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ، فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا“ [النساء/۱۲۹] (اور اگر تم چاہو تو بھی بیویوں کے مابین پوری طرح انصاف اور یکساں قلبی تعلق رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے پس (کم از کم) ایسا نہ ہونے دینا کہ تم ایک بیوی

کی طرف اس طرح جھک جاؤ کہ دوسری زوجہ کو ”کالمعلقة“ (نہ بیاہی نہ بیوہ) بنا کر چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح حال چاہو گے اور اللہ سے ڈرو گے تو بے شک اللہ غفور بھی ہے رحیم بھی ہے (تمہاری چھوٹی موٹی غیر ارادی غلطیوں کو معاف فرمادے گا)۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب اور پاکیزہ معاشرتی نظام میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، بعض اوقات مرد کی فطری ضرورت، عورتوں کی شرح آبادی میں اضافہ، پہلی بیوی کی بیماری اور دیگر وجود سے دوسری شادی ایک ضرورت بن جاتی ہے اور تعدد ازدواج کی یہ محدود قانونی اجازت غیر قانونی اور غیر محدود تعدد ازدواج کو روکتی ہے جو عورت کے لئے زیادہ نقصان دہ اور معاشرہ میں گندگی پھیلنے کا ذریعہ ہے، اسلامی حدود میں رہتے ہوئے تعدد ازدواج ایک رحمت ہے نہ کہ زحمت، اور سماجی مسائل کا ایک پاکیزہ حل ہے نہ کہ سماجی دشواری، دنیا میں جب بھی اور جن قوموں میں بھی تعدد ازدواج پر پابندی عائد کی گئی وہاں بدکاری کا سیلاب امڈ پڑا، نکاح کی شرح کم ہونے لگی اور خاندانی نظام کے تار و پود بکھر کر رہ گئے، اس لئے اگرچہ کہ مسلمانوں میں دوسری اقوام کے مقابلہ تعدد ازدواج کا تناسب نہایت قلیل ہے لیکن کوئی حقیقت پسند اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس کی گنجائش باقی رکھنا ایک سماجی ضرورت ہے۔

مہر:

پھر قرآن نے یہ حکم دیا کہ نکاح میں مہر کا ہونا ضروری ہے، فرمایا گیا: ”أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ“ [النساء/۲۴] (مذکور الصدر رشتوں کو چھوڑ کر باقی رشتوں سے نکاح حلال ہے اس طرح کہ تم اپنا مال (مہر) خرچ کر کے اپنے لئے زوجہ حاصل کرو)۔

یہ بھی تاکید کی گئی کہ مہر کو بوجھ نہ سمجھنا چاہئے اور اس کی ادائیگی سے بچنے کے

بہانے نہ تلاش کرنا چاہئے بلکہ خوش دلی کے ساتھ عورت کو اس کا مہر ادا کر دینا چاہئے۔

’’وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً‘‘ [النساء/۴] (اور دو اپنی بیویوں کو ان کا مہر ہنسی خوشی)۔

مہر اتنا اہم حق ہے کہ اگر نکاح کے وقت مہر نہ ہونے کی شرط عورت سے منوالی جائے جب بھی اس کا اعتبار نہ ہوگا اور نکاح کے بعد مہر واجب ہوگا۔ ہاں، اگر نکاح کے بعد عورت اپنی رضامندی اور خوش دلی سے پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ معاف کر دے تو اسے اس کا حق حاصل ہے۔

’’فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْساً فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا‘‘ [النساء/۴] (پس اگر تمہاری بیویاں اپنے مہر کا کچھ حصہ اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو کھاؤ اس کو ہنسی خوشی)۔

زوجین کے اہم حقوق:

قرآن مجید نے زوجین کے حقوق کے بارے میں بھی بنیادی باتیں بتائی ہیں، مردوں سے کہا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ بہترین معاشرت اور بھلا برتاؤ اختیار کریں ’’عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ‘‘ [النساء/۱۹] (اور گذران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح)۔ معاشرت بالمعروف کا لفظ نہایت ہی بلیغ اور جامع ہے جس میں حسن سلوک کی تمام صورتیں داخل ہیں، عورت کی معاشی کفالت، اس کی تمام ضروریات کی تکمیل، اس کی دلداری، اس کے جذبات کی رعایت اور اس کے ساتھ تحمل و بردباری کا لحاظ، یہ تمام باتیں معاشرت بالمعروف میں داخل ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ برت کر دکھایا ہے۔

خیال رہے کہ قرآن کی تعبیر ایسی جامع ہے کہ ہر دور اور ہر ملک میں رائج وہ عرف جو خواتین کے لئے عزت اور ان کی کرامت اور ان کے ساتھ محبت کی ضمانت دیتا ہو وہ سب

کچھ ’’معروف‘‘ میں داخل ہیں۔

مرد قوام اور رئیس خانہ ہے:

مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے لئے دو پہیوں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ضروری ہے کہ کسی کی حیثیت صدر خاندان کی بھی ہو جو خاندان کا محافظ اور اس کا منتظم ہو، یہ مقام مردوں کو عطا فرمایا گیا، ارشاد ہے: ’’اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ‘‘ [النساء/۳۴] (مرد حاکم (محافظ اور ذمہ دار) ہے عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر، اور خرچ کئے انہوں نے اپنے مال)۔

قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ مردوں کو کیوں قوام بنایا گیا ہے؟ اس لئے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر کچھ خاص صلاحیتیں رکھی ہیں، کسب معاش کی، خاندان اور افراد خاندان کی حفاظت و نگہداشت کی، تحمل و بردباری اور ضبط کی، دوسرے اس لئے کہ نکاح کے بعد جب خاندان کی تشکیل ہوتی ہے تو نہ صرف بیوی بلکہ اس خاندان کے تمام افراد کی کفالت و پرورش کا بوجھ بھی وہی اٹھاتا ہے، گویا مرد کو قوام قرار دے کر بظاہر اس کے مقام و مرتبے میں اضافہ کیا گیا ہے، ’’وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ‘‘ [البقرہ/۲۲۹] (اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے)۔ لیکن درحقیقت یہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہے اور اسے اس کے فرائض کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

مرد کی قوامیت، خاندانی نظام کی برقراری کے لئے اسی قدر ضروری ہے جتنا کسی ملک کے لئے سربراہ حکومت کا ہونا، مغربی تہذیب نے مساوات مرد و زن کے نام پر جو کچھ کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے، جس کے نتیجے میں خاندانی نظام بکھر گیا ہے، ازدواجی رشتہ خود غرضی پر مبنی اور محبت سے عاری رشتہ بن گیا ہے، نکاح کی شرح گھٹتی جا رہی ہے اور طلاق

کی شرح بڑھتی جارہی ہے، والدین اور اولاد میں محبت ایسی مفقود ہے کہ بوڑھے ماں باپ Old Age Hostel میں پناہ لینے پر مجبور ہیں، اور ننھے منّے بچے اپنے والدین کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں جن کو ہفتے میں دو دن ہی اپنے والدین کے ساتھ رہنا اور وقت گذارنا نصیب ہوتا ہے، اور اب صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کی سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے مطابق دادا، دادی، نانا، نانی اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بھی بچوں کے باپ ماں یعنی اپنی براہ راست اولاد سے اجازت لینے کے محتاج ہوں گے۔ یہ ہے جدید تہذیب کی ترقی پسندانہ بے رحمی جو اسلام کی صلہ رحمی کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے مقابلے میں پیش کی جارہی ہے (دیکھئے راشٹریہ سہارا، ۷؍جون ۲۰۰۰ء صفحہ ۸، خبر بحوالہ ڈی پی اے)۔

اس صورت حال نے مغربی سماج کو کھوکھلا کردیا ہے اور لوگ قلبی سکون کے لئے اسی طرح بے چین ہیں جیسے کوئی پیاسا صحرا میں پانی کے لئے۔

جن لوگوں نے مغربی معاشرہ کو دیکھا ہے وہی صحیح طور پر اس بات کا ادراک کرسکتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی نظام میں کتنی رحمت اور عافیت ہے، اور زندگی کے لئے یہ کیسی فرحت بخش ٹھنڈی چھاؤں ہے، جس چیز کو ہم مغرب کی ترقی سمجھتے ہیں وہ محض ایک سراب ہے جس نے آزادی کے نام پر عورتوں کو ایسا غلام بنایا ہے کہ شاید زمانہ جاہلیت میں بھی عورتیں اس طرح مردوں کی ہوس کا سامان اور ان کی تجارت اور مادی حرص کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنی ہوں۔

لیکن مرد کے قوام ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عورتوں کے حقوق سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگے اور ان کے حقوق کی اہمیت کو نظر انداز کردے، بلکہ ارشاد خداوندی ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی قدر اہم وہ حقوق بھی ہیں جو عورتوں کے مردوں پر ہیں: ’’وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ‘‘ [البقرہ ۲۲۸] (اور عورتوں کا بھی حق

ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق)۔

ازدواجی الجھنوں کا حل:

خدانخواستہ نکاح کے بعد میاں بیوی کے درمیان کچھ تناؤ پیدا ہوجائے تو قرآن مجید نے اس کا بھی حل بتایا ہے اور وہ یہ کہ پہلے سمجھایا جائے، پندوموعظت سے کام لیا جائے، اگر بیوی اس کے باوجود نافرمانی پر کمربستہ ہو تو چند دنوں بستر الگ کرلیا جائے، اسی کو قرآن میں ’’**هجر في المضاجع**‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے، بستر الگ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کو گھر سے نکال باہر کیا جائے، یا اس کو اس کے میکے چھوڑ کر اس کے والدین پر بوجھ بنادیا جائے، یا اس کو کمرہ سے باہر نکال کر اس کی تذلیل وتحقیر کی جائے، بلکہ خواب گاہ ایک ہی ہو لیکن چند دنوں بے تعلقی برتی جائے تاکہ اس کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو، اگر اس سے بھی کام نہ چلے اور عورت میں اصلاح کے آثار نمایاں نہ ہوں تو معمولی سرزنش کی بھی اجازت دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا‘‘ [النساء ۳۴] (وہ عورتیں جن کی نافرمانی کا تم کو ڈر ہو تم پہلے انہیں نصیحت کرو اور سمجھاؤ (اور نہ مانیں) تو ان سے بستر جدا کرلو (پھر بھی نہ مانیں) تو (معمولی) زدوکوب کرو، پھر ان پر مار پیٹ کے بہانے مت تلاش کرو بے شک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا)۔

بیوی کی سرزنش اور اس کے حدود:

یہاں قرآن مجید نے نافرمان بیوی کی سرزنش کی جو اجازت دی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جانور کی طرح عورتوں کی پٹائی کی جائے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے

بھی ایک حد مقرر فرمائی ہے، اور وہ حد یہ ہے کہ ''ضرب غیر مبرح''ہو، یعنی تکلیف دہ حد تک مار پیٹ نہ ہو، فقہاء اور مفسرین نے اس کو مزید واضح کیا ہے کہ تکلیف دہ مار پیٹ سے کیا مراد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح نہ مارا جائے کہ جسم پر نشان پڑ جائے، ورم آجائے، کہیں سے جسم کا کوئی حصہ پھول پھٹ جائے، خون نکل آئے، چہرے پر اور جسم کے نازک حصوں پر نہ مارا جائے، بلکہ بعض اہم علم کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسواک سے مار سکتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصل مقصد مارنا نہیں ہے بلکہ عورت کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ اس کی جسمانی سرزنش کی گئی ہے اور بس، اس آیت سے اس ایذا رسانی اور تحقیر کا جواز ہرگز فراہم نہیں کیا جاسکتا جو آج ہمارے سماج میں جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا جارہا ہے۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ قرآن نے بستر الگ کرنے، اور جسمانی سرزنش کی اجازت کب دی ہے؟ اس وقت جب کہ بیوی شریعت کی جانب سے شوہر کو دیئے گئے حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی برتتی ہو، ایسا نہیں ہے کہ شوہر جس بات کی خواہش رکھتا ہو شرعاً بیوی کے لئے اس کا پورا کرنا واجب ہو یا نہ ہو، اور شریعت کی نگاہ میں شوہر کا وہ حق بیوی پر عائد ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، بہرصورت مرد کے لئے بیوی کی سرزنش کا جواز حاصل ہوجائے، کھانا خراب پک جائے تو بیوی کو سزا دی جائے، شوہر کے غیر محرم رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے بیوی نہ آئے تو اس کی سرزنش کی جائے، شوہر کے پورے خاندان کی خدمت بیوی پر لازم قرار دی جائے اور وہ اسے پوری نہ کرسکے تو بیوی پر ہاتھ اٹھایا جائے، یہاں تک کہ سسرال سے پیسے طلب کئے جائیں اور وہ اپنے ماں باپ سے پیسے نہ لاسکے تو اس کے لئے اسے اذیت دی جائے، یہ ساری باتیں سخت گناہ ہیں، نہ ان باتوں کا مطالبہ بیوی سے درست ہے اور نہ ان کے پورا نہ کرنے کی وجہ سے اس کی سرزنش اور ایذا رسانی جائز ہے۔

فقہاء نے ان امور کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے بیوی کی سرزنش کی اجازت

ہے، اور اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ بیوی کوئی ایسا عمل نہ کرتی ہو جس سے اس کا کردار مشکوک ہوتا ہو، اپنے غیر محرموں سے ملاقات کرتی ہو، ان کے سامنے آتی ہو، ان سے بات چیت کرتی ہو، حالانکہ شوہر نے اس سے منع کر رکھا ہے تو یہ اصل سبب ہے جس کی وجہ سے بیوی کی سرزنش کی اجازت ہے، اس کے باوجود کہ بعض حالات میں سرزنش کی اجازت دی گئی ہے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیوی پر ہاتھ اٹھانے والے اچھے لوگ نہیں ہوتے (ابوداؤد: باب فی ضرب النساء)۔

اختلاف دور کرنے میں سماج کی ذمہ داری:

اگر ان تمام مراحل سے گذرنے کے باوجود تعلقات بہتر نہ ہو پائے، اور بیوی نافرمانی پر مصر ہو، تو قرآن مجید نے میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی کی ذمہ داری سماج پر رکھا ہے کہ اب سماج کے بزرگ اور سمجھ دار لوگوں کا فریضہ ہے کہ وہ بیچ میں پڑ کر باہمی اختلاف کو رفع کرنے اور صلح کرانے کی کوشش کریں، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ آج اگر ہمارے سماج میں کوئی اختلاف رونما ہوتا ہے اور کوئی نزاع پیدا ہوتی ہے، خواہ میاں بیوی کے درمیان ہو، والدین اولاد کے درمیان ہو، یا کسی بھی دو مسلمان یا دو خاندان کے درمیان ہو، تو نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء اور سماج کے بااثر اور ذمہ دار لوگ بھی کنارہ کشی اختیار کرلیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جس کا معاملہ ہے وہ سمجھے، ہم اس معاملہ میں کیوں پڑیں، لیکن یہ فکر درست اور سنجیدہ نہیں ہے، مسلمانوں کا کام دلوں کو جوڑنا اور فاصلوں کو سمیٹنا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو نماز کی جماعت کا اتنا اہتمام تھا کہ مرض وفات میں بھی جب تک بالکل معذور نہ ہوگئے جماعت فوت نہ ہونے پائی، لیکن بنوعوف کے دو مسلمان خاندانوں میں صلح کرانے میں آپ کو اتنی تاخیر ہوگئی کہ نماز عصر میں آپ دیر سے تشریف لائے جب کہ حضرت بلالؓ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے آگے

بڑھا چکے تھے۔

اس سے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے، ان کے اختلاف کو رفع کرنے اور ان کی صفوں میں وحدت کو باقی رکھنے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بالخصوص میاں بیوی کے اختلاف کو دور کرنا ان کے رشتے کو استوار رکھنا تو اور بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان سب سے زیادہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ کسی شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرادے "أَن يُّفَرِّقَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ"۔

اس لئے علماء اور مسلم سماج کے ذمہ دار حضرات خواہ مرد ہوں یا خواتین، ان کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر معاملات کو سلجھانے اور اختلاف کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور اسے اپنی دینی ذمہ داری سمجھیں۔

پس اگر زوجین کے درمیان اختلاف اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ خود اس کو سلجھانے سے قاصر ہوں تو قرآن مجید کا ارشاد ہے:

"وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُّرِيدَا إِصْلاَحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا" [النساء/٣٥] (اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے)۔

طلاق - ایک ناخوشگوار ضرورت:

اگر پندوموعظت، چند دنوں کا ترک تعلق، معمولی سرزنش اور خاندان کے

بزرگوں کی اصلاحی کوششوں کے باوجود اختلاف دور نہ ہو سکے اور مزاج میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو تو اب قرآن نے طلاق کی اجازت دی ہے، طلاق اسلام کی نگاہ میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جتنی چیزوں کی اجازت دی گئی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ شئی "طلاق" ہے۔

"أَبْغَضُ الْحَلاَلِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الطَّلاَقُ" (سنن ابی داؤد: باب فی کراہیۃ الطلاق، حدیث: ٢١٧٨)۔

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض اوقات طلاق ایک ناخوشگوار ضرورت بن جاتی ہے، طلاق ایک تکلیف دہ چیز ہے لیکن بعض دفعہ یہ اس سے زیادہ تکلیف دہ باتوں کو روکنے کا ذریعہ بنتی ہے، اگر میاں بیوی کے درمیان تعلقات ناخوشگوار ہوں، ایک ساتھ نباہ دشوار ہو جائے، مرد اس عورت سے نجات پانا چاہتا ہو اور اس کے لئے قید نکاح سے باہر آنے کا کوئی قانونی راستہ کھلا نہ رکھا جائے تو وہ غیر قانونی راستے اختیار کرتا ہے اور اس میں عورت کا زیادہ نقصان ہے، آج کل ہندو سماج میں زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بیویوں کو جلانے اور قتل کرنے کے جو واقعات پیش آرہے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں، چونکہ قانونی طور پر علاحدگی کو دشوار بنادیا گیا ہے اس لئے بہت سے لوگ اس طرح کے غیر قانونی راستے اختیار کرتے ہیں، اسلام میں طلاق کی اجازت کا منشاء یہی ہے کہ گو یہ ناپسندیدہ فعل ہے لیکن جب دو میاں بیوی کا ساتھ چلنا دشوار ہو جائے تو اس قید سے آزاد ہونے کے لئے ایسا راستہ کھلا رکھا جائے کہ لوگ لاقانونیت پر مجبور نہ ہوں، پس اس میں عورت کی زندگی اور اس کی عزت وآبرو کے لئے تحفظ ہے۔

طلاق دینے کا طریقہ:

پھر قرآن مجید نے طلاق کے آداب واحکام بھی بتائے ہیں کہ طلاق کس وقت دی

جائے اور کتنی دی جائے؟ طلاق کے سلسلے میں قرآن مجید نے یہ اصول بتایا کہ طلاق دیتے ہوئے عدت کو ملحوظ رکھا جائے، طلاق اس طرح نہ دی جائے کہ عدت طویل ہوجائے یعنی ایسی پاکی (طہر) کی حالت میں طلاق دی جائے جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو، کیونکہ اگر ناپاکی (حیض) کی حالت میں طلاق دی گئی تو عدت طویل ہوجائے اور اس حالت میں یوں بھی طلاق دینے کی ممانعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے حالت حیض میں طلاق دینے سے سختی سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی نے طلاق دے دی ہو اور اور رجعت کی گنجائش ہو تو آپ نے فرمایا کہ بیوی کو لوٹا لے، کیونکہ حیض کی حالت میں ایک حد تک بیوی کی طرف رغبت کا سامان نہیں ہوتا، تو ممکن ہے کہ اس حالت میں سنجیدہ فیصلہ کے تحت طلاق نہیں دی گئی ہو، بلکہ بے رغبتی کی بنا پر طلاق دی ہو، حالانکہ طلاق ایسا حق نہیں کہ اتنی جلد بازی میں کسی سوچے سمجھے اور سنجیدہ فیصلہ کے بغیر اس کا استعمال کیا جائے، اسی طرح اگر طلاق ایسے طہر میں دی گئی جس میں صحبت کی جا چکی ہو تو اندیشہ ہے کہ عدت طویل ہوجائے کیونکہ اگر حمل ٹھہر جائے اور وہ حاملہ ہوجائے تو اب اسے وضع حمل تک عدت گذارنی ہوگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ**'' [الطلاق/۱] (اے نبی! جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت پر اور گنتے رہو عدت کو)۔

عدت:

اسلام میں نسب کی حفاظت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی لئے شریعت نے عدت کا حکم رکھا ہے کہ جب کسی عورت کی اپنے شوہر سے جدائی ہو تو دوسرے نکاح اور اس جدائی کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ نسب مشتبہ نہ ہو، پھر عدت کے درمیان بیوی کا نفقہ اور اس کی رہائش کا انتظام طلاق دینے والے شوہر کے ذمہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ**'' [الطلاق/۱] (مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں)۔

اس میں ایک اور حکمت بھی پوشیدہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ ایک یا دو طلاق دی ہو، تو عدت کے درمیان اسے اپنی بیوی کو لوٹانے کا حق حاصل ہے، اگر عورت طلاق دینے والے شوہر کے گھر میں ہی رہے تو موافقت اور موانست کے امکانات زیادہ ہیں، اس طرح ایک ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ جڑ سکتا ہے۔

پھر جب عدت پوری ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ**'' [الطلاق/۲] (پھر جب پہنچیں اپنے وعدہ کو تو رکھ لو ان کو دستور کے موافق یا چھوڑ دو ان کو دستور کے موافق اور گواہ کر لو دو معتبر اپنے میں کے)۔

طلاق رجعی:

یعنی عدت جب ختم ہونے کو آئے تو آخری فیصلہ کرنا ہے، اگر بیوی کو رکھنا چاہے تو اسے لوٹا لے، اور بہتر ہے کہ لوٹانے پر دو گواہ بھی بنالے تاکہ آئندہ کسی نزاع اور تہمت کا اندیشہ نہ ہو، اور اگر بیوی کی طرف رغبت نہ ہو اور نباہ کی امید نہ رہے تو بھلے طریقے پر علاحدہ کردے، بہتر طریقہ پر علاحدگی سے مراد یہ ہے کہ عدت گذر جانے دے، جیسے ہی عدت گذر جائے گی عورت بائنہ ہوجائے گی، البتہ اس بات کی گنجائش باقی رہے گی کہ اگر مرد و عورت کو پشیمانی ہو اور وہ دوبارہ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہونا چاہیں تو نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرلیں۔

یہ گنجائش ایک اور دو طلاق کی صورت میں ہے، اگر تین طلاق دے دی تو اگر وہ خاتون عدت گذرنے کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کرلے اور ان دونوں کے مابین

ازدواجی رشتہ قائم ہوجائے، بعدازاں خدانخواستہ کسی وجہ سے اس دوسرے شوہر سے بھی اس کی علاحدگی ہوجائے اور پھر یہ دوسری عدت بھی گذر جائے، بعدازاں اگر یہ خاتون اور پہلا مرد دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَه‘ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَه‘**'' [البقرہ/۲۳۰] (پھر اگر عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا)۔

تین طلاق دینا سخت گناہ ہے کیونکہ اس کے بعد ندامت کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ مکمل علاحدگی کے لئے تین بار طلاق دینا ضروری نہیں، اگر لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ ایک یا دوبار طلاق دی گئی اور عدت میں لوٹایا نہ گیا تو رشتۂ نکاح خود بخود ختم ہوجائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**اَلطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ**'' [البقرہ/۲۲۹] (یعنی اگر ایک یا دوبار طلاق دی گئی تو مرد کو یہ حق ہوگا کہ وہ بہتر طریقے پر عورت کو اپنے نکاح میں واپس لے لے یا پھر اس کی عدت گذرنے دے اور اسے تمام حقوق ادا کرکے علاحدگی اختیار کرلے)۔

طلاق بائن:

اسی طرح اگر طلاق بائن دی گئی یعنی بیوی سے کہا گیا کہ میں تجھے طلاق بائن دیتا ہوں یا صریح لفظ طلاق کے بجائے طلاق کے لئے کوئی اور کنایہ کا لفظ استعمال کیا گیا جس سے طلاق کا معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہو اور دوسرا معنی بھی نکلتا ہو تو اس سے بھی طلاق بائن واقع ہوتی ہے، طلاق بائن کے ذریعہ بھی رشتہ نکاح مکمل طور پر منقطع ہوجاتا ہے، البتہ ایسی صورت میں دوبارہ ازدواجی رشتہ استوار کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے، اس لئے اگر کبھی طلاق دینے کے سوا چارہ نہ رہے تو یا تو لفظ طلاق کے ذریعہ ایک یا دو طلاق دی جائے اور

عدت میں لوٹایا نہ جائے، یہ سمجھنا کہ جب تک تین طلاق نہیں دیں گے پوری طرح رشتۂ نکاح ختم ہی نہیں ہوگا، محض ناواقفیت اور جہالت کی بات ہے، اور اس طرح طلاق دینا شریعت میں انتہائی ناپسندیدہ اور سخت گناہ ہے، وکلاء، قضاۃ اور پنچ کے لوگوں کو بھی اس سلسلے میں احتیاط کرنی چاہئے اور تین طلاقیں نہ دلوانی چاہئے، طلاق رجعی کے بعد عدت گذرنے کی صورت میں خود بخود طلاق بائن ہوجاتی ہے۔

خلع:

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر نفرت واختلاف کا کوئی سبب موجود نہیں لیکن کسی وجہ سے میاں و بیوی کے مزاج میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی اور نکاح کا اصل مقصود باہمی محبت ومودت اور سکون قلب کی کیفیت مفقود ہوجاتی ہے، حالانکہ شوہر کوئی ایسی زیادتی نہیں کرتا جسے قانون کے دائرہ میں حق تلفی کہا جاسکے لیکن بیوی کی اپنے شوہر کی طرف رغبت نہیں ہوتی، اسلام نے ایسے مواقع کے لئے خلع کی صورت رکھی ہے کہ بیوی پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ معاف کرکے اسے طلاق پر آمادہ کرلے، خلع دراصل زوجین کی باہمی رضامندی سے علاحدگی کا فیصلہ کرنا ہے، جس میں عورت کی طرف سے عوض دیا جاتا ہے لیکن یہ عوض اس سے زیادہ نہیں جو مرد نے اپنی زوجہ کو دیا ہے یعنی مہر، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''**وَلاَ يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا إِلَّآ أَنْ يَّخَافَا أَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ، فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ، تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلاَ تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ**'' [البقرہ/۲۲۹] (اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جب کہ خاوند اور عورت دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر

اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جاوے اور یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سوان سے آگے مت بڑھو اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم)۔

غرض اگر عورت کی طرف سے زیادتی نہ ہو تب تو مرد کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ طلاق کا کوئی معاوضہ وصول کرے، ہاں! اگر عورت کی طرف سے زیادتی، اور وہ کسی معقول وجہ کے بغیر طلاق کی طلب گار ہو تو مرد کو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی واپس لینا چاہئے جو اس نے بطور مہر کے دیا ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ ہرگز نہ کرے، اور یقیناً یہ اس کی مردانہ غیرت وحمیت کے بھی خلاف ہے کہ شریعت نے اسے طلاق کا اختیار دے کر جو اعزاز عطا کیا ہے وہ اسے کسب زر کے لئے استعمال کرے۔

لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جیسے طلاق آخری چارہ کار ہے اسی طرح عورت کی طرف سے خلع کا مطالبہ بھی نہایت ہی ناپسندیدہ بات ہے اور جب تک نباہ بالکل دشوار نہ ہو جائے خلع کا مطالبہ کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔

خلع کی ایک اور مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات میاں بیوی میں اختلاف کا کوئی ایسا سبب ہوتا ہے کہ خود بیوی بھی برسرعام اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتی کیونکہ اس سے خود عورت کی عزت وآبرو بھی مجروح ہوسکتی ہے، ان حالات میں خلع زوجین کے درمیان علاحدگی کا ایک باعزت طریقہ ہے، جس میں فریقین کے لئے عافیت اور اپنے وقار کا تحفظ ہے۔

نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ:

نکاح کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ یہ مرد وعورت کے درمیان زندگی کی رفاقت کا ایک باعزت معاہدہ ہے، ایسا نہیں ہے کہ نکاح کی وجہ سے شوہر بیوی کا مالک بن جاتا ہے اور اس کی حیثیت جائداد اور پراپرٹی کی ہو جاتی ہے، بلکہ وہ معاہدہ کے دو فریقوں میں سے ایک فریق ہے، جب طلاق ہو جائے یا کسی اور طریقہ پر ان دونوں میں علاحدگی

عمل میں آئے تو رشتۂ نکاح ختم ہو جاتا ہے اور عورت مرد کے قید نکاح سے آزاد ہو جاتی ہے، لہذا ظاہر ہے کہ عورت کو شوہر سے بحیثیت بیوی جو نفقہ ملا کرتا تھا، اب وہ اس نفقہ کی حق دار باقی نہیں رہی، اگر اس کو اب بھی بیوی فرض کر کے نفقہ دلایا جائے تو یہ نہ صرف اس مرد کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ اس عورت کی غیرت وحمیت کے بھی خلاف ہے کہ ایک ایسا شخص جو اب اس کا شوہر نہیں رہا اسے خواہ مخواہ اس کا شوہر قرار دیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورت کے نفقہ کے سلسلے میں فرمایا ہے:

’’وَ إِنْ كُنَّ أُولاَتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ وَ أْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَّ إِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ أُخْرٰى ‘‘[الطلاق/٦] (اور اگر رکھتی ہوں پیٹ میں بچہ تو ان پر خرچ کرو جب تک بچہ نہ پیدا ہو جائے، پھر اگر وہ بچہ کو دودھ پلائیں تمہاری خاطر، تو دو ان کو ان کا بدلہ، اور سکھاؤ آپس میں نیکی، اور اگر ضد کرو آپس میں تو دودھ پلائیں گی اس کی خاطر اور کوئی عورت)۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حاملہ مطلقہ عورت کا نفقہ وضع حمل تک واجب قرار دیا ہے کیونکہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے چونکہ عدت گذرنے تک وہ دوسرا نکاح نہیں کرسکتیں اس لئے سابق شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رہے گا، عدت گذرنے کے بعد چونکہ وہ اس مرد کی بیوی نہیں رہی، اس لئے نفقہ کی ذمہ داری بھی اب اس سے متعلق نہیں ہوگی۔

دفعہ ۱۲۵ اور دفعہ ۱۲۷ نفقہ کی مدت کو عدت سے آگے تک لے جاتی ہے، یہ اس آیت کی صریح خلاف ورزی ہے، قرآن مجید نے اس موقع پر ’’حتی‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے: ’’حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ‘‘ ’’حتی‘‘ عربی زبان میں اس بات کے لئے آتا ہے کہ اس سے پہلے والی بات بعد کے لئے نہیں رہے گی۔

مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری:

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت نے مطلقہ عورتوں کو بے سہارا چھوڑ دیا ہے، اصل میں نکاح کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے عورت اپنے سابق خاندان سے مربوط رہتی ہے، اس کو اپنے ماں باپ کے مال سے میراث ملتی ہے، بعض اوقات وہ بھائی بہنوں کی جائداد میں بھی حقدار ہوتی ہے، اس لئے یہ اصول مقرر کیا گیا کہ امکانی طور پر جو لوگ اس عورت کے مال میں سے وارث ہوسکتے ہیں یعنی اگر وہ عورت جائداد چھوڑ کر وفات پا جائے تو جن رشتہ داروں کو اس کے مال میں سے میراث مل سکتی ہے انہیں لوگوں پر ان کے حصۂ میراث کی نسبت سے اس کا نفقہ واجب ہوگا، کبھی والدین پر، کبھی بھائی بہنوں پر، کبھی دوسرے اعزہ واقارب پر، اور اگر کوئی بھی نہ ہو تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو نفقہ دے۔ اسلام جس فلاحی ریاست کی تعلیم دیتا ہے اس میں کوئی بھی بے سہارا نہیں رہ سکتا۔

اجرت پرورش:

اس کے علاوہ اگر سابق شوہر کو اس عورت سے اولاد ہو تو جب تک وہ بچے اس عورت کی پرورش میں رہیں، یعنی لڑکے سات آٹھ سال کی عمر ہونے تک، اور لڑکیاں بالغ ہونے تک، اس وقت تک بطور اجرت پرورش مرد کو اپنے بچوں کے علاوہ اس عورت کے گذر بسر کا سامان بھی کرنا ہوگا۔

البتہ اس کی نوعیت نفقۂ زوجیت کی نہیں بلکہ اجرت پرورش کی ہے، وہ بیوی ہونے کی حیثیت سے ایک اجنبی مرد سے نفقہ حاصل نہیں کررہی ہے بلکہ اپنی محنت کی اجرت وصول کررہی ہے، اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا چھوڑ دیا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔

دوسری ایک اہم بات یہ ہے کہ بیوہ ہو یا مطلقہ، اسلام دوسرا نکاح کر لینے کا حکم دیتا ہے ''وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ '' کا مطلب یہی ہے کہ کوئی خاتون ممکن حد تک اس حال میں نہیں رہے کہ اس کا کوئی شوہر نہ ہو، شوہر جو عورت کے تحفظ اور اس کی کفالت کا ذمہ دار ہے۔

اسلام کا نظام میراث:

مسلم پرسنل لا کے ذیل میں نکاح وطلاق کے علاوہ ایک اہم ترین مسئلہ میراث کا بھی آتا ہے، شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ اس نے دولت کو مرتکز رکھنے کے بجائے اس کی تقسیم اور اس کو مسلسل گردش میں رکھنے کا نظام قائم کیا ہے، اسی لئے بعض دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے ''پہلوٹھے'' یعنی بڑے لڑکے کو پوری میراث دے کر دوسری اولاد کو، یا لڑکوں کو میراث دے کر لڑکیوں کو میراث سے محروم نہیں کیا بلکہ میراث کیلئے ایک جامع، متوازن اور نہایت ہی مبنی بر عقل قانون عطا فرمایا ہے۔

قانون میراث کے چند بنیادی اصول:

قانون میراث میں چند باتیں بنیادی اصول کا درجہ رکھتی ہیں، اول یہ کہ حق میراث صاحب مال کی موت کے بعد اس کے ترکہ سے متعلق ہوتا ہے، زندگی میں نہیں، جب تک ماں باپ زندہ ہیں ان کی جائداد میں بچوں کا، یا شوہر کی جائداد میں بیوی، یا بیوی کی جائداد میں شوہر کا حق نہیں ہے، کیونکہ قرآن نے اس چیز میں میراث واجب قرار دی ہے جو متروکہ ہو یعنی جسے مرنے والا چھوڑ کر گیا ہو۔ ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ '' [النساء/۷] (مردوں کا بھی حصہ ہے ماں وباپ اور قرابت والوں کے ترکے میں)۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے قریب ترین رشتہ دار ہی میراث کے حق دار

ہوں گے، قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں نسبتاً دور کے رشتہ دار میراث سے محروم ہوجائیں گے، چنانچہ اوپر جو آیت مذکور ہے اس میں صراحت موجود ہے کہ میراث کے حقدار ”أقربون“ یعنی متوفی کے قریب ترین رشتہ دار ہوں گے، اور غور کیجئے تو یہ نہایت ضروری اور منطقی بات ہے، کیونکہ اگر کسی شخص کی میراث اس کے دور ونزدیک کے تمام رشتہ داروں میں تقسیم کی جائے تو ایک تو تمام رشتہ داروں کی کھوج اور ان تک ان کا حق پہنچانا دشوار ہوگا، اور دوسرے میراث کے اتنے حصے ہوجائیں گے کہ ورثہ کو اس سے کوئی قابل لحاظ منفعت حاصل نہ ہوگی، اسی اصول کی بنا پر بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کا حق متعلق نہیں ہوتا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ مورث کا ترکہ کم ہو یا زیادہ، قلیل مقدار ہو یا کثیر، تمام ورثہ کا اس سے حق متعلق ہوگا، ایسا نہیں کہ چونکہ جائداد کم ہے یا یہ کہ چھوٹا سا مکان ہے اس لئے اس میں بیٹیوں کو کیا حق دیا جائے، یہ درست نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا“ [النساء/۷] یعنی ترکہ کم ہو یا زیادہ، اس میں حصے مقرر کئے ہوئے ہیں۔

مرد وعورت کے درمیان فرق کیوں؟

چوتھی بات یہ ہے کہ شریعت نے عام حالات میں مردوں کا حصہ بمقابلہ عورتوں کے دوگنا رکھا ہے، بیٹیوں کے مقابلے بیٹوں کا، بیوی کے مقابلے شوہر کا، اور بعض حالات میں ماں کے مقابلے باپ کا حصہ زیادہ مقرر کیا گیا ہے، یہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور مردوں کی جانبداری نہیں، بلکہ یہ ذمہ داریوں کی نسبت سے ان کے حقوق کی تعیین ہے، غور کیجئے کہ شریعت نے عورتوں کو اکثر حالات میں خود اپنی کفالت سے بھی آزاد رکھا ہے اور ان پر دوسروں کی پرورش اور کفالت کا بار بھی نہیں رکھا گیا، اس کے برخلاف مرد کو خود اپنی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں، بیوی کا نفقہ بھی اس کے ذمہ ہے، بچوں کی پرورش اور ان کی ضروریات بھی اسے ہی پوری کرنی ہے، اسے بوڑھے ماں وباپ کی بھی کفالت کرنی ہے، تو ظاہر ہے کہ

جس پر ذمہ داریوں کا بوجھ زیادہ ہوگا، اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے، بلکہ اگر ذمہ داریوں کی نسبت سے حق میراث پر غور کیا جائے تو اس میں عورتوں کی رعایت اور ان کا پاس ولحاظ زیادہ ہے، کیونکہ عورتوں پر مالی ذمہ داری کچھ نہیں رکھی گئی، اس کے باوجود مردوں کے مقابلے ان کو آدھا حق دیا گیا، اور بعض حالات میں تو مردوں کے برابر ان کا حق بھی رکھا گیا ہے۔

اولاد کا حصہ:

قرآن مجید نے جس تفصیل سے میراث کے احکام ذکر فرمائے ہیں، معاشرتی زندگی کے شاید ہی کسی شعبہ کو اس تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو، اولاد کے حق میراث کے بارے میں فرمایا گیا:

”يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ“ [النساء/۱۱] (حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک لڑکے کا حصہ ہے دو لڑکیوں کے برابر، پھر اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کے لئے ہے دو تہائی ترکہ میں سے، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے۔)

یعنی اگر لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی تو ایک لڑکے کا حصہ ایک لڑکی کے مقابلے دوگنا ہوگا۔ اگر لڑکے نہ ہوں اور صرف ایک لڑکی ہو تو تنہا وہ لڑکی آدھا ترکہ پائے گی، اور اگر لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو سبھی لڑکیوں کو ملا کر ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

والدین کا حق:

والدین کے حق میراث کے بارے میں فرمایا گیا:

”وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ

فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ أَبَوٰهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ''[النساء/۱۱] (اور میت کے ماں وباپ کو ہرایک کے لئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے ترکہ میں سے اگر میت کے اولاد ہے، اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اس کے ماں وباپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی، پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ، اجرائے وصیت اور ادائے دین کے بعد)۔

یعنی اگر میت صاحب اولاد ہو تو ماں اور باپ دونوں میں سے ہر ایک کو اس کے متروکہ میں چھٹا حصہ ملے گا، یہاں ماں اور باپ دونوں کے حقوق برابر کر دیئے گئے ہیں، اور اگر مرنے والے کی کوئی اولاد نہیں ہے تو تہائی حصہ ماں کو اور باقی عصبہ ہونے کے اعتبار سے باپ کو پہنچے گا بشرطیکہ میت کے بھائی نہ ہوں، اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی باپ کو۔

شوہر وبیوی کا حق:

شوہر کے حق میراث کے بارے میں فرمایا گیا:

''وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۞ [النساء/۱۲] (اور تمہارا ہے آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد، اور اگر ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں، بعد وصیت کے جو کر گئیں یا بعد قرض کے)۔

یعنی اگر بیوی صاحب اولاد نہ ہو تو شوہر اس کے ترکہ میں نصف کا حقدار ہوگا اور اگر بیوی کی اولاد ہو تو شوہر کو چوتھا حصہ ملے گا۔

''وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ، فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ

فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ''[النساء/۱۲] (اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے کہ جو کچھ تم نے چھوڑا بعد وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے)۔

ایک اہم اور قابل توجہ نکتہ:

آگے قرآن مجید نے ان لوگوں کا حق میراث ذکر کیا ہے جو لاولد ہونے کی حالت میں دنیا سے گذر گئے ہوں، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ''[النساء/۱۱] (تمہارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے، بیشک اللہ خبردار ہے حکمت والا)۔

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح فرمادیا کہ میراث کے حصے متعین کرنے میں تمہاری مرضی اور تمہاری خواہش کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے، اور یہ نظام ایسا رکھا گیا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کس رشتے دار سے کس کو زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے۔

پھر تمام احکام میراث کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

''تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ''[النساء/۱۳-۱۴] (یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اس کو داخل کرے گا جنت میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، ہمیشہ رہیں گے ان میں، اور

یہی ہے بڑی کامیابی، اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جاوے اس کی حدوں سے، ڈالے گا اس کو آگ میں، ہمیشہ رہے گا اس میں، اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے)۔

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی تنبیہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ احکام میراث میری قائم کی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کیا جائے، جو لوگ ان حدود سے تجاوز کریں گے، ان کا ٹھکانا ہمیشہ کے لئے جہنم ہے .... افسوس کہ برادران وطن کے رسوم ورواجات سے متاثر ہوکر مسلمان بھی قانون میراث کے معاملے میں بڑی زیادتیاں کرتے ہیں اور بہت سے علاقوں میں بیٹی اور بیوہ کو میراث سے محروم رکھا جاتا ہے، یہ صریح زیادتی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے بغاوت ہے۔

مہر بھی دَین میں داخل ہے:

قرآن نے احکام میراث کا ذکر کرتے ہوئے بار بار کہا ہے کہ وصیت کے نفاذ اور میت کا دَین ادا کرنے کے بعد ہی میراث جاری ہوگی، اور میراث سے متعلق آیات کے اخیر میں مزید وضاحت سے فرمادیا گیا:

’’مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ‘‘[النساء/۱۲] (بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو، یہ حکم ہے اللہ کا اور اللہ ہی سب کچھ جاننے والا تحمل کرنے والا)۔

یعنی میت کے ترکہ میں سے پہلے اس کا دَین ادا کیا جائے، اور اگر شوہر نے بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو یقیناً وہ مہر بھی دَین میں داخل ہے، ترکہ میں سے پہلے اس کا دَین ادا کیا جانا چاہئے، بعض علاقوں میں شوہر کی وفات کے بعد بیوہ پر طرح طرح کا دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیا جاتا ہے، یا مہر معاف نہیں کرایا جاتا لیکن اس کو غیر اہم سمجھتے ہوئے متروکہ میں

سے مہر ادا ہی نہیں کیا جاتا، یہ دونوں صورتیں ناجائز اور ظلم اور زیادتی کی ہیں۔

قانون وصیت:

اگر مرنے والے نے کوئی وصیت کی ہو تو دَین کی ادائیگی کے بعد پہلے وصیت پر عمل کیا جائے گا، لیکن اس سلسلے میں بھی قرآن وحدیث میں کچھ اصول بتائے گئے ہیں: اول یہ کہ وصیت کا مقصود اصل ورثہ کو ضرر پہنچانا نہ ہو، اس لئے وصیت نہ کی جائے کہ ان کا حق کم ہو جائے، یا دَین کا جھوٹا اقرار نہ کیا جائے کہ اس سے لازمی طور پر ورثہ کا حق متاثر ہوگا، قرآن مجید نے اسی کو کہا ہے ’’غَيۡرَ مُضَآرٍّ ‘‘[النساء/۱۲]۔

وصیت کی مقدار:

دوسرے رسول اللہ ﷺ نے وصیت کے بارے میں یہ اصول بیان فرمایا کہ وصیت زیادہ سے زیادہ ترکہ کا ایک تہائی کے بقدر ہونی چاہئے، اس سے زیادہ کی وصیت کرنا درست نہیں، اور کی جائے تو معتبر نہیں، اگر مرنے والے نے ایک تہائی سے زیادہ کے لئے وصیت کردی ہو تو ایک تہائی کی حد تک ہی یہ وصیت نافذ ہو سکے گی، اس کا مقصد اصل ورثہ کو نقصان سے بچانا ہے۔

وارث کے حق میں وصیت:

تیسرا اصول یہ ہے کہ وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: لَاوَصِيَّةَ لِوَارِثٍ‘‘ اور اس پر پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے، آپؐ کے اس ارشاد کا منشاء ورثہ کے درمیان عدل قائم رکھنا ہے، اگر وارث کے لئے وصیت درست ہو تو یہ ورثہ کے درمیان نامساویانہ اور غیر عادلانہ عمل ہوگا۔

یتیم پوتے کے مسئلہ کا حل:

قانون وصیت سے اس پوتے کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے جو اپنے دادا کی زندگی میں والد کی وفات کی وجہ سے دادا کے ترکہ سے محروم ہو گیا ہے، ایسے پوتے پوتیوں کے حق میں دادا کے لئے اپنی زندگی میں ہبہ کرنے کی گنجائش ہے جس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں، اور اگر زندگی میں ہبہ کرنا مناسب نہ سمجھتا ہو تو موت کے بعد کے لئے ایک تہائی کی حد تک وصیت کرنے کا حق حاصل ہے، جو ممکن ہے کہ باپ کے واسطہ سے اسے جو حصہ ملتا، مقدار میں اس سے بڑھ جائے، یہ سماج کے پڑھے لکھے، سمجھ دار اور اہل علم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی بیٹا اپنے ماں و باپ کی زندگی میں دنیا سے رخصت ہو جائے تو مرحوم کے والدین کو ہبہ اور وصیت کے بارے میں شرعی احکام سمجھا دیئے جائیں تا کہ یہ یتیم بچے اور بچیاں محروم نہ ہوں، اور جو حق میراث ان کو اپنے باپ کے واسطہ سے حاصل ہوتا اس کا بدل انہیں مل جائے۔

لے پالک کا مسئلہ:

اسلام سے پہلے بچوں کو گود لینے اور متبنّٰی کو اپنی صلبی اولاد کا درجہ دینے کا تصور موجود تھا، دور جاہلیت میں عرب بھی ان گود لیے ہوئے بچوں کو اپنی اولاد تصور کرتے تھے اور ان کی بیویوں کو حقیقی بہو کی طرح حرام سمجھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، حضرت زیدؓ اور ان کی بیوی حضرت زینبؓ میں موافقت اور ہم آہنگی باقی نہ رہی اور آخر نوبت طلاق تک آ پہنچی، حضرت زینبؓ سے حضور ﷺ کا نکاح بحکم خداوندی ہوا تا کہ عملی طور پر قیامت تک کے لئے متبنّٰی کے صلبی بیٹا ہونے اور اس کی بیوی کے بہو ہونے کا تصور ختم ہو جائے اور زمانہ جاہلیت کی یہ رسم ہمیشہ کیلئے مٹ جائے، قرآن مجید نے

اس کو یوں بیان کیا ہے:

''**وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَآءَ كُمْ أَبْنَآءَ كُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقُّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ. أُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ**'' [الاحزاب۴-۵] (اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے، یہ تمہاری بات ہے اپنے منہ کی، اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی سمجھاتا ہے راہ، پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے، یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں، پھر اگر نہ جانتے ہو ان کے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں)۔

ایک مسلمان کسی مسلمان بچے کی کفالت و پرورش اپنے ذمے لے لے اور اپنی اولاد کی طرح محبت سے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے، یہ بُری بات نہیں بلکہ بہت اجر و ثواب کا کام ہے، اور اگر وہ چاہے تو اپنی حیات میں اپنی جائداد میں سے اس بچے کو کچھ حصہ کر دے یا (اگر وہ کسی اور رشتے سے وارث نہیں ہوتا) تو اس کے لئے ایک تہائی کی حد تک وصیت بھی کر سکتا ہے، لیکن ان کو احکام و قوانین میں اپنی اولاد کا درجہ دے دینا اور میراث میں حقدار بنا دینا صحیح نہیں ہے، اسی طرح کسی بچے یا بچی کو گود لینے کی وجہ سے ایسا رشتہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے کہ حرام نکاح حلال ہو جائے یا حلال ہو تو حرام ہو جائے، اسی طرح گود لینے کی وجہ سے محروم بھی نہیں ہو سکتا اور حجاب اور پردے کے مسئلہ پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا، غیر محرم ہے غیر محرم رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کے جن قوانین کو ہم مسلم پرسنل لا کہتے ہیں وہ دراصل قرآن و حدیث کے صریح احکام ہیں اور مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مطلب قرآن و حدیث کے احکام کو بدل دینا ہے، اس لئے کوئی مسلمان خواہ وہ مسلمان مرد ہو یا عورت، وہ ان احکام سے آزاد نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ براہ راست قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔

مسلم پرسنل لا کی شرعی اہمیت:

جو احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں ان کو ماننا مسلمان اور صاحب ایمان ہونے کے لئے بنیادی شرط ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ'' [الاحزاب/۳۶] (کسی مسلمان مرد اور عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا)۔

گویا جب قرآن وحدیث کے ذریعہ کوئی حکم سامنے آجائے تو اب کوئی اختیار نہیں، ان احکام کے واضح ہونے کے باوجود جو اللہ اور رسول کے بجائے ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا'' [النساء/] (اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو موڑ دیں گے اس کو اسی طرف جدھر وہ مڑ گیا ہے اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

آج مسلمانوں سے جس یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، یہ قانون کس طرح کا ہوگا؟ اسپیشل میریج ایکٹ، اور انڈین سکسیشن ایکٹ میں اس کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے، جس کے تحت بین المذاہب شادیاں ہوسکتی ہیں، اسپیشل میریج ایکٹ کے تحت نکاح کرنے والوں پر شریعت کا قانونِ میراث لاگو نہیں ہوگا، اسی طرح انڈین سکسیشن ایکٹ کی پہلی دفعہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر شخص کو وصیت کرنے کا حق ہے، چاہے جس کے لئے وصیت کرے اور جتنی مقدار کے لئے کردے، لے پالک کے قانون

سے مسلمانوں کو استثناء دیا گیا ہے، لیکن دوسری قوموں کے لئے یہی قانون نافذ ہے کہ متبنّٰی کی حیثیت اصل اولاد کی ہوگی، تو ظاہر ہے کہ یکساں سول کوڈ میں بھی اسی طرح کی بات آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ تمام احکام قرآن کے صریح احکام کے خلاف ہیں، اس لئے یکساں سول کوڈ ایک مسلمان کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہے۔

اور اس سے ان قوانین کو قبول کرنے کا مطالبہ کرنا نہ صرف مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے حق میں مداخلت ہے بلکہ ان کو عقیدہ وضمیر کی آزادی سے بھی محروم کرنے کے مترادف ہے، اور درحقیقت جمہوریت کا قتل اور ملک کے سیکولر کردار کو مسخ کردینے کی نہایت مذموم اور ناپسندیدہ کوشش ہے۔

ان سطور سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلم پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے اور قانون شریعت کس قدر انسانی فطرت اور انسان کی سماجی ضروریات سے ہم آہنگ ہے۔

تیسرا مسئلہ: خطرات اور اندیشے:

اب ایک نظر ان خطرات پر بھی ڈالئے جو مسلم پرسنل لا کے گرد منڈلا رہے ہیں، یہ بات پہلے آچکی ہے کہ دستور کے بنیادی حقوق میں مسلم پرسنل لا کو تحفظ دیا گیا ہے، دوسری طرف رہنما اصول کی دفعہ ۴۴ یکساں سول کوڈ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، بظاہر دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ معاشرتی قوانین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں پہلے ہی سے یکساں سول کوڈ موجود ہے اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس دفعہ کا اصل نشانہ یہی عائلی قوانین ہیں، چنانچہ جس وقت دستور بن رہا تھا اس وقت بھی ہمارے زعماء نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا، مولانا حسرت موہانی اور جناب محمد اسماعیل مرحوم نیز دستور ساز اسمبلی کے بعض مسلم ارکان نے اس دفعہ میں ترمیم پیش کی تھی کہ جن

قوموں کا پرسنل لا ہے، ان کو ہاتھ لگائے بغیر یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے گا۔

لیکن ملک ابھی آزاد ہوا تھا، اس وقت مسلمان جن حالات سے گذر رہے تھے اس سے ہر شخص واقف ہے، مسلمان اس وقت اس موقف میں نہیں تھے کہ اس کے خلاف کوئی تحریک چلا سکیں، چنانچہ یہ ترمیمات رد کردی گئیں اور ڈاکٹر امبیڈکر کی اس وضاحت پر لوگوں کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا کہ ''کوئی پاگل ہی سرکار ہوگی جو مسلمانوں کے پرسنل لا کو ختم کرے گی، کیا وہ پسند کریں گے کہ مسلمان بغاوت کر جائیں''؟

لیکن جوں جوں حالات بدلتے گئے حکومت کی بدنیتی سامنے آنے لگی، اور انہی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اب حالات پہلے سے زیادہ خراب ہیں، پہلے جو سیاسی پارٹیاں اقتدار پر تھیں وہ کم از کم زبان سے قانون شریعت میں تبدیلی کی بات نہیں کہتی تھیں بلکہ چور دروازے سے اس کام کو کرنا چاہتی تھیں لیکن اب فسطائی طاقتیں بام اقتدار پر چڑھ چکی ہیں اور انہوں نے اپنے ایجنڈے میں ''یکساں سول کوڈ'' کی بات رکھی ہے، اس لئے اب ہمیں زیادہ قوت، حوصلہ مندی، تدبر، اور سمجھداری کے ساتھ یہ لڑائی لڑنی ہے اور ان کا مقابلہ کرنا ہے۔

کیا یکساں سول کوڈ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی؟

جو لوگ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یکساں معاشرتی قوانین سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی اور تمام قومیں ایک دوسرے سے قریب آئیں گی، لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے، ہمارے ہی ملک کے صوبہ پنجاب میں ایک عرصے تک سکھ اور ہندو ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے ہیں، آسام میں آسامیوں اور بنگالیوں بلکہ خود آسام کے مختلف قبائل میں جس درجہ آویزشیں پائی جاتی ہیں، ان سے کون ناواقف ہوگا؟ حالانکہ ان کے پرسنل لا ایک ہی ہیں، برطانیہ اور جرمنی میں کیسی خونریز

جنگیں ہو چکی ہیں جنہیں تاریخ میں ''جنگ عظیم'' کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کا مذہب ایک ہی تھا اور ان کے پرسنل لا بھی ایک ہی تھے، لیکن مسلم پرسنل لا کی وحدت نے ان بھیانک جنگوں کو نہیں روکا، ماضی قریب میں عراق اور کویت کی جنگ کل کی بات ہے، حالانکہ دونوں ملکوں کے رہنے والے مسلمان تھے اور ان کے پرسنل لا بھی ایک تھے، تو اگر پرسنل لا کی وحدت قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں مؤثر ہوتی تو یقیناً ایسی بھیانک جنگیں نہ ہوئی ہوتیں۔

اور پھر سوال یہ ہے کہ قومی یکجہتی کے لئے کہاں تک وحدت پیدا کی جاسکتی ہے؟ اگر معاشرتی قوانین یکساں کر بھی دیئے جائیں تو تہذیب وتمدن اور ثقافت کا اختلاف ضرور باقی رہے گا، زندگی میں انسان قدم قدم پر جس چیز سے دوچار ہوتا ہے اور جس سے تعصب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے وہ ''زبان'' ہے، ملک میں کتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہیں، بلکہ آج تک جنوبی ہند کی ریاستوں نے رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو قبول نہیں کیا ہے، تو کیا قومی یکجہتی کے نام پر تمام قوموں پر ایک ہی زبان مسلط کردی جائے گی!؟ اور اگر ایسا سوچا گیا تو کیا اس ملک کی وحدت اور سالمیت باقی بھی رہے گی!؟

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ پرسنل لا کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہونے کا خیال محض ایک وہم ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت، بلکہ یہ ملک کے لئے سخت نقصان دہ ہے، اس ملک کی اساس ہی کثیر مذہبی جمہوریت کے تصور پر ہے، اسی ہمہ رنگی میں اس ملک کی بقاء، اس کی سالمیت اور اس کی خوبصورتی ہے اور یہی اس دستور کی روح ہے جسے قوم کے معماروں نے خوب سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔

چوتھا مسئلہ: ہماری ذمہ داریاں:

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور جو خطرات

ہمارے سامنے ہیں ان کا مقابلہ کریں؟

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کے عادلانہ قانون کے نفاذ کے لئے ہم امت کو مشینری اور سسٹم فراہم کریں۔ یعنی نظام قضا قائم کریں۔ اور مسلمان رضا کارانہ طور پر شریعت کے فیصلوں کو اپنے اوپر نافذ کریں۔

ا۔ نظام قضاء کا قیام اور اس کی شرعی اور سماجی اہمیت:

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں اور انہیں جو مقام عطا کیا ہے دنیا کے کسی مذہب اور کسی قانون میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے عدالتی نظام نے ان حقوق کے حاصل کرنے کو بہت ہی دشوار بنا دیا ہے، مقدمات کی طویل کارروائیاں اور اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے مظلوموں کو اپنا حق حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس لئے قانون شریعت سے فائدہ اٹھانے کے لئے دار القضاء کا نظام نہ صرف شرعی نقطۂ نظر سے بلکہ سماجی اعتبار سے بھی نہایت ضروری اور اہم ہے۔

مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہو، انہیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی زندگی گذارنی ہے اور کتاب وسنت کے فیصلوں کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا'' [النساء/۶۵] (سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے)۔

اللہ اور رسول کا فیصلہ کیسے معلوم ہوگا؟ قاضی کے فیصلہ کے ذریعہ، اس لئے مسلمان خواہ کسی علاقہ میں ہو، نظام قضاء کا قائم کرنا ان پر واجب ہے، متعدد فقہاء نے بار بار اس بات کو لکھا ہے، علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''وہ ممالک جہاں مسلمان مغلوب ہیں جیسے قرطبہ اور بلنسیہ آج کے زمانے میں، ایسے ملکوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی ایک شخص کے امیر ہونے پر متفق ہو جائیں اور وہی امیر ان کے لئے قاضی مقرر کرے، یا خود خصومات کی سماعت کر کے فیصلہ کرے''۔

چنانچہ ہندوستان میں جب انگریزوں نے تسلط حاصل کرلیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں ہندوستان کے مسلمانوں پر نظام قضاء کے قیام کو لازم قرار دیا اور مختلف علماء نے اس کے لئے کوششیں کیں، بالآخر اس عظیم فریضہ محکمہ کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کو اٹھایا اور انہوں نے بہار واڑیسہ میں نہایت منظّم طریقہ پر نظام قضاء قائم فرمایا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو شروع سے نظام قضاء کی اہمیت کا احساس ہے، اجلاس جے پور میں اس کے لئے باضابطہ تجویز منظور ہو چکی ہے اور بورڈ نے بار بار علماء اور ارباب حل وعقد کو اس جانب متوجہ کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے ملک میں نظام قضاء کا جال بچھا دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ اپنے نزاعی معاملات کو قاضیوں کے ذریعہ حل کریں، دار القضاء کے پاس گو پولس کی طاقت نہ ہو، لیکن اس کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہوگی اور اس کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول کی مرضیات کا آئینہ دار ہوگا، انشاء اللہ یہی چیز مسلمانوں کو دار القضاء تک کھینچ کر لائے گی، انہیں انصاف بھی ملے گا، وہ عدالتوں میں بار بار حاضری کی ذلت سے بھی بچیں گے، جھوٹی قسموں سے اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں گے، بلاوجہ کثیر رقم کے بے جا

خرچ سے بھی اپنے آپ کو بچا سکیں گے، اور اسلام کے سماجی قوانین میں جو راحت، جو عدل، جو رعایت اور عافیت ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے، حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلانے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں، حقوق خواہ کتنے بھی مقرر کر لئے جائیں، اگر وہ حاصل نہ ہو سکیں اور ان کے حصول کو آسان نہ بنایا جا سکے تو ان کا کچھ فائدہ نہیں۔

۲۔قانون شریعت کی افادیت کا ادراک:

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود قانون شریعت اور اس کی اہمیت سے واقف ہوں اور اپنے آپ کو اتنا باشعور بنائیں کہ نہ صرف دوسرے مسلمانوں بلکہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی ان قوانین کی افادیت، فطرت انسانی سے ان کی مطابقت اور انسانی زندگی کے لئے ان کی اہمیت بتا سکیں اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کر سکیں، کیونکہ یہ جمہوریت کو بچانے اور سیکولرزم کی حفاظت کرنے کی لڑائی ہے، اس میں ہمیں دوسری اقلیتوں اور خود اکثریتی فرقہ کے سیکولر اذہان کے حامل اشخاص کو بھی ساتھ لینا ہے اس لئے کہ یہ محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اس ملک میں مذہبی قدروں کی بقا کا مسئلہ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی جنھوں نے یا تو اسلام کو پڑھا نہیں یا مستشرقین کی کتابوں میں پڑھا ہے، وہ خود اسلام کے تئیں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۳۔احکام شریعت پر عمل:

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم خود قانون شریعت پر عمل کریں، حقیقت یہ ہے کہ ہم خود ہی اللہ اور رسول کے احکام کو توڑتے ہیں، عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کو روا رکھتے ہیں، بیٹی کو میراث نہیں دی جاتی، بیوہ کو اس کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے، شادیوں میں

جہیز اور تلک کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے، بڑی تعداد میں بارات لے جائی جاتی ہے، بعض لوگ عورتوں کو لٹکا کر چھوڑ دیتے ہیں نہ ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور نہ انہیں طلاق دے کر اپنے نکاح سے آزاد کرتے ہیں، محض جذبہ عناد کے تحت ایک سے زیادہ نکاح کئے جاتے ہیں اور بیویوں کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ نہیں کیا جاتا، کسی ضرورت شرعی کے بغیر محض وقتی اشتعال کے تحت طلاق دی جاتی ہے اور وہ بھی ''ایک'' نہیں بلکہ ''تین''۔ غرض بہت سی معاشرتی بیماریاں ہیں جو کچھ تو جہالت اور خدا ناترسی کی وجہ سے ہیں، اور کچھ برادران وطن کے رسم و رواج سے متاثر ہو کر ہمارے سماج میں گھس آئی ہیں، اگر ہم نے ان برائیوں کو دور نہیں کیا اور خود اپنے اوپر قانون شریعت کو نافذ نہیں کیا تو اللہ کی مدد ہم سے اٹھ جائے گی، اور ظاہر ہے کہ نصرت خداوندی کے بغیر ہمارا یہ کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے دوسروں کو اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ قانون شریعت پر انگلیاں اٹھائیں اور شریعت مطہرہ کے خلاف زبان کھولیں، اس سے زیادہ بدنصیبی اور بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر انگشت نمائی کا ذریعہ بنیں!

۴۔اتحاد امت:

تیسری ضروری چیز امت کا اتحاد و اتفاق ہے، ۱۹۷۲ء میں ہمارے بزرگوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صورت میں ایک ایسا قافلہ ترتیب دیا جس میں حوصلہ تھا، جذبۂ اتحاد تھا، قانون شریعت کے تحفظ کا عزم تھا، اور ہر قیمت پر راہ کی مشکلات سے گذر کر منزل تک پہنچنے کا پختہ ارادہ تھا، یہی چیز تھی جس نے حکومت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا، اور اسی وجہ سے مختلف مواقع پر قانون شریعت کی حفاظت کی مہم میں ہم نے کامیابیاں حاصل کیں، اور آئندہ بھی یہی اتحاد ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔

مصیبت اور آزمائش دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کر دیتی ہیں، جب سیلاب آتا ہے اور آندھیاں اٹھتی ہیں تو شیر اور ہاتھی اور سانپ اور بیولے بھی مل کر اپنی جان بچاتے ہیں، آج مسلمان آزمائش کی اسی گھڑی میں ہیں، فرقہ پرست طاقتیں اقتدار کے نشہ میں ہیں اور وہ علانیہ مسلمانوں کو قانون شریعت سے محروم کرنے اور ہم پر خودساختہ قوانین کو مسلط کرنے کے درپے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کریں تاکہ ہمارا شیرازہ بکھر جائے کیونکہ ایک کمزور اور بکھری ہوئی قوم کو اپنی گرفت میں لینا آسان ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے گروہی، مسلکی اور جماعتی اختلافات سے اوپر اٹھ کر مشترکہ مسائل میں اتحاد کا ثبوت دیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ**'' [الانفال/۴۶] (اور آپس میں نہ جھگڑو، پس بزدل ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا)۔

آخری بات:

اگر ہم اپنی صفوں کو متحد رکھیں گے، اشتعال سے بچتے ہوئے تدبر اور حکمت عملی کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے، اللہ کے دین کی محبت ہمارا زادسفر ہو اور حوصلہ وہمت ہمارا ہتھیار، باہمی اعتماد اور ہر حال میں نظم واجتماعیت کے ساتھ رہنے کا عزم، تو کوئی طاقت نہیں جو ہماری راہ میں رکاوٹ بن سکے اور ہمیں منزل مقصود تک پہنچنے سے روک سکے، **وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ.**

This document was created with Win2PDF available at http://www.win2pdf.com.
The unregistered version of Win2PDF is for evaluation or non-commercial use only.
This page will not be added after purchasing Win2PDF.